دین کا تصور

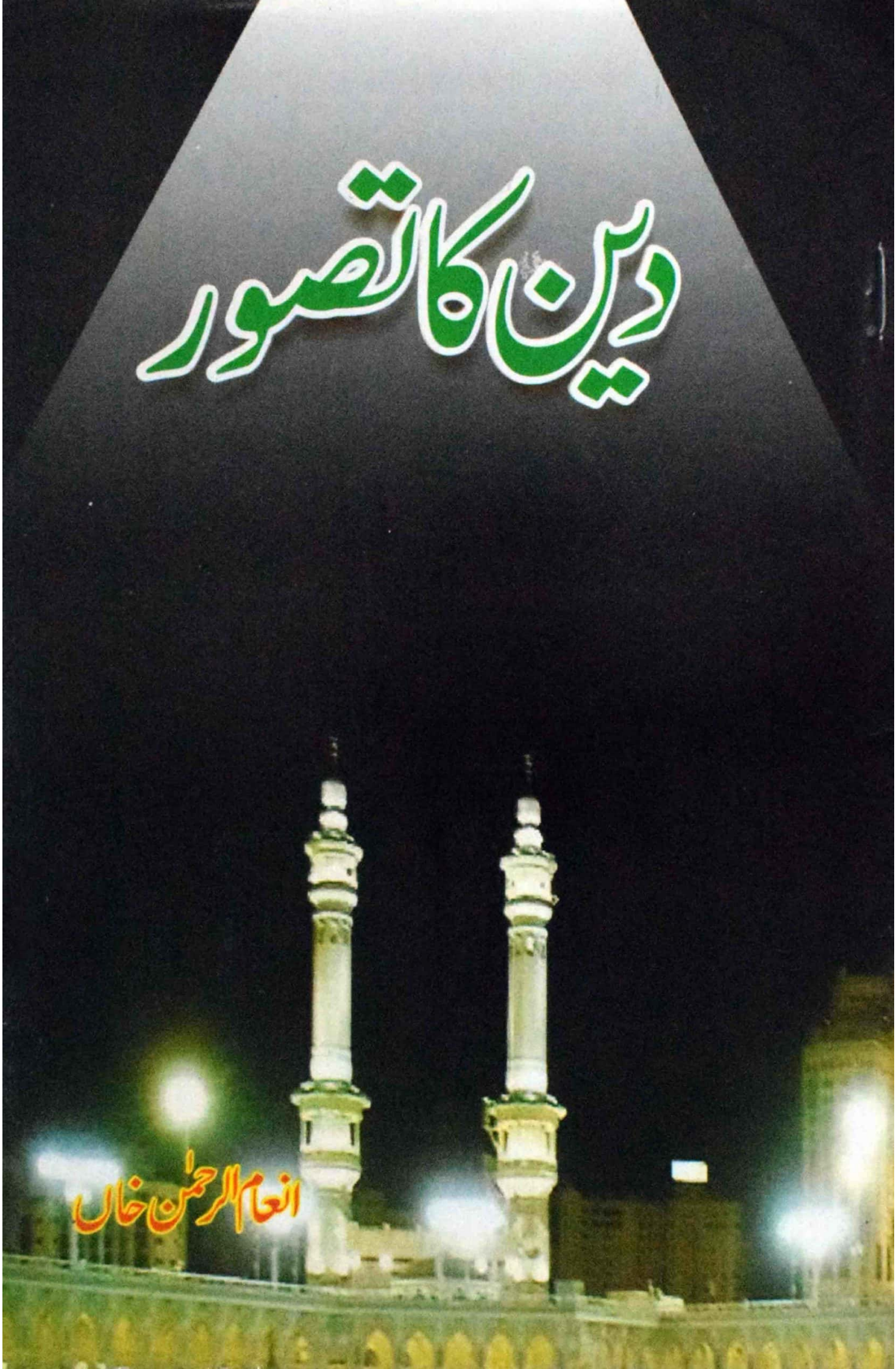

انعام الرحمٰن خاں

ترتیب

مذہب کا اسلامی تصور	۶
لا الٰہ الا اللہ کی دعوت	۷
دعوت و تبلیغ کا ردِّ عمل	۸
اثرات و نتائج	۹
اسلام اور ہمارا ملک	۱۰
بگاڑ کے وجوہ	۱۲
خواص میں بگاڑ	۱۲
دین و دنیا کی تفریق	۱۳
سوچنے کی بات	۱۴

یہ اپنی زندگی کو دنیوی زندگی اور مذہبی زندگی کے دو خانوں میں بانٹ دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ان مختلف اجزا کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا ہے۔ اور قلب بھی کچھ نہ کچھ اس زہر سے متاثر ہوا ہے یہ تو اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے۔ عمل کو جب بھی عقیدہ سے بے تعلق کر دیا جائے گا عقیدہ بھی مرجھانے سے نہیں بچے گا۔ جہاں یہ بات صحیح ہے کہ عقیدہ ہی عمل کا بیج ہے وہیں یہ بات بھی صحیح ہے کہ عمل سے عقیدہ کو توانائی ملتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو طاقت بخشتے ہیں اور طاقت حاصل بھی کرتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ الگ کر دیا جائے تو دونوں آہستہ آہستہ پژمردہ ہو جائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین کا تصور

اسلام کو چھوڑ کر دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ چند عقائد اور چند عبادات اور چند رسوم کا نام مذہب ہے۔ انسان کی دینوی زندگی اور اس کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی حیثیت ایک ایسے ضمیمے کی ہے، جو اس دنیوی زندگی کے بعد نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ مذہب کا تعلق بس اس رشتہ سے ہے، جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے اونچے مرتبے حاصل کرنا ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات سے بے تعلق ہو کر پوجا پاٹ، ذکر و شغل اور مذہبی رسوم میں مشغول ہو جائے۔ مگر جو شخص اتنے اونچے مرتبے نہ چاہتا ہو بلکہ صرف نجات چاہتا ہو ساتھ ہی یہ خواہش بھی رکھتا ہو کہ اس کے معبود کی نظر عنایت اس پر رہے اور وہ دنیوی معاملات میں اسے برکت عطا کرتا رہے اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ مذہبی رنگ کی کچھ چیزوں کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ مذہبی دنیا میں عام طور پر یہ خیال رہا ہے اور اب بھی ہے کہ انسان کا تعلق خود اپنی ذات سے، دوسرے انسانوں سے اور اپنے آس پاس کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز اور ان دونوں چیزوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اوپر جو بیان کیا گیا یہ مذہب کا جاہلی تصور ہے، اور کبھی اس تصور کی بنیاد پر تہذیب و تمدن کی عمارت نہیں بن سکی۔ ظاہر ہے کہ جو عقیدہ صرف چند مذہبی رسمیں سکھاتا ہو وہ پوری تہذیب کا بوجھ کس

طرح سہار سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب وتمدن ایک دوسرے سے علیٰحدہ رہے ہیں۔ سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشات اور اپنے تجربات کی بنا پر جس طرح چاہا چلایا۔ اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کرتے رہے۔ مذہب چوں کہ ان کی زندگی کا اصل مسئلہ نہیں رہا بلکہ محض ایک ضمیمہ کی حیثیت سے ساتھ لگا رہا۔ یعنی یہ کہ زندگی کی پوری کتاب کا مضمون وموضوع تو ایک طرح کا رہا اور اس کے ساتھ بالکل دوسرے مضمون کے چند ورق لگا دیے گئے۔ اسی لیے یہ ضمیمہ (یعنی کتاب کے آخر میں لگے ہوئے چند ورق جن میں کچھ دعاؤں، کچھ رسموں اور کچھ تمناؤں کے سوا کچھ بھی درج نہیں تھا) ہر قسم کے سیاسی ظلم وستم، ہر طرح کی معاشی لوٹ کھسوٹ، ہر قسم کی معاشرتی اونچ نیچ، ہر قسم کی تمدنی بے اعتدالیوں کے ساتھ جڑا رہا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا۔ جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، سود خواری اور قارونیت کا بھی۔ بدکاری اور قحبہ گری کا بھی۔ اور ہر شخص آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ یہ دعا گو مذہب آج بھی ان سب چیزوں کا ساتھ ہی نہیں دے رہا ہے بلکہ ان کا خدمت گار بنا ہوا ہے۔

مذہب کا اسلامی تصور

جس غرض سے دنیا کے ہر حصہ اور ہر قوم میں انبیاء بھیجے جاتے رہے اور آخر میں جس غرض سے محمد عربی ﷺ بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس محدود اور جاہلی تصور کو مٹا کر ایک صحیح، معقول اور دل لگتا تصور پیش کریں۔ اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی تصور اور اسی عقیدہ کی بنیاد پر تہذیب وتمدن کا پورا نظام قائم کر دیں۔ آپ نے پورے زور کے ساتھ بتایا کہ مذہب اگر انسان کی زندگی کا صرف ایک شعبہ یا پوری کتاب زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہے تو بالکل بے معنی ہے۔ ایسی بے معنی چیز کو دین ومذہب کہنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے، جو زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اس کو حرکت میں لانے والی طاقت ہو۔ صحیح اور غلط کو بتانے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر سیدھے راستہ اور ٹیڑھے راستوں کے درمیان فرق کر کے دکھائے، ٹیڑھے راستوں سے بچائے اور سیدھے راستہ پر آگے بڑھنے کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس طویل سفر میں جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے انسان کو ہر گھاٹی اور ہر موڑ سے کامیابی کے ساتھ گزار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ اگر اس کو بھی دنیا اور اس کے معاملات کا رہنما نہ بنایا جائے اور اس مذہب کو ماننے والے بھی پرانے جاہلی تصور کے مطابق دنیا اور اس کے معاملات سے بے تعلق ہو کر محض ذکر و شغل میں مصروف ہو جائیں تو اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہ مذہب جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے۔ اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی بحث کرتا ہے۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو جائے۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کو درست بھی کرتے ہیں اور مضبوط بھی۔ یہ دونوں تعلق مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں۔ اور مذہب کا اصلی کام اس کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی اور عملی طور پر تیار کرتا ہے۔ اسلام کے دیے ہوئے اس تصور کی رو سے جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے۔ اور جو مذہب اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (البقرۃ:۱۹)

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔''

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی دعوت

اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان کی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خود مختار سمجھ بیٹھے اور اپنا الٰہ آپ بن جائے یا پھر یہ کہ وہ الٰہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو حکم چلانے کا مجاز سمجھ لے خواہ وہ دوسرا انسان ہو یا غیر انسان، یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلام کی رو سے کوئی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اسلام سب سے پہلے انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک بادشاہ موجود ہے اور اس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹانے سے مٹ سکتی

ہے، نہ تو اس کی سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ لہٰذا عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے حکم کے آگے سر جھکا دے اور فرماں بردار بندہ بن کر رہ۔ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ کسی کا حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی دعائیں سننے والا اور کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں، رب اور مولا صرف ایک ہے، لہٰذا تو ہر غلامی اور ہر اطاعت و پابندی سے انکار کر دے اور اسی ایک کا غلام اور فرماں بردار بن جا۔

توحید کی یہ پکار کوئی ایسا مذہبی عقیدہ نہیں ہے، جس کا تعلق صرف مذہبی آداب و رسوم سے ہو اور زندگی کے دوسرے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت والوہیت کی بنیاد پر بنا ہو جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور توحید کی بنیاد پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا ہمارے موذن کو اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کی پکار لگاتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں۔ نہ سننے والوں کو اس میں کوئی مقصد اور ارادہ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے۔ اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ و فرماں روا نہیں ہے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے۔ کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سوا میں سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس پکار کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ بات ہے جسے ڈاکٹر اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

دعوت و تبلیغ کا ردِّ عمل

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب رسولِ کریم ﷺ نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے اور سننے والے دونوں خوب سمجھتے تھے کہ اس پکار کا کیا مطلب ہے۔ اسی لیے جس جس پر جس پہلو سے اس

پکار کی چوٹ پڑتی تھی وہ تلملا جاتا تھا۔ پجاریوں کو اپنی مذہبی اجارہ داری کے لیے اس میں خطرہ نظر آیا، رئیسوں کو اپنی ریاست کے لیے، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کے لیے۔ نسل پرستوں پر اپنی نسلی برتری کے لیے اور قوم پرستوں کو اپنی قومیت کے لیے، غرض ہر بت کے پجاری کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اس ایک آواز میں نظر آیا۔ اور وہ سب لوگ جو آپس میں لڑا کرتے تھے اس آواز کو دبانے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد ﷺ کی طرف آئے، جو حقیقت کو سمجھنے اور اس کے آگے سر جھکانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جن کے اندر صداقت پسندی کا وہ جوہر موجود تھا کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس دعوت کے لیے ضرورت تھی۔ کسی کا روزگار چھوٹا، کسی کو گھر والوں نے نکال دیا، کسی کے عزیز دوست، آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی، کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی آنکھ پھوڑی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ ان کا آنا ضروری تھا۔ اور جب بھی یہ دعوت اپنے صحیح مزاج کے ساتھ اٹھے گی اس کے علمبرداروں کی تواضع انھیں چیزوں سے ہوگی۔ اس کے بغیر یہ دعوت نہ مضبوط ہو سکتی ہے اور نہ اس طرح پھیل سکتی ہے کہ ہر حق پسند آدمی کے دل کی کھڑکیاں اس کے لیے کھل جائیں۔

اثرات ونتائج

ایک صداقت پر اس طرح ایمان لانے کا کہ ایمان لانے والا ایمان کے تمام تقاضے پورے کرنے اور ہر خطرہ سے ٹکرا جانے کا ارادہ کر کے ایمان لائے۔ پہلا فائدہ یہ تھا کہ کچے کیرکٹر اور کمزور ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسل آدم کا بہترین جوہر تھا۔ سچے اور جان دار آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی کہ جو بھی آئے وہ اس بھٹی میں سے گزر کر آئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی۔ ان کے اندر خالص اسلامی کیرکٹر پیدا ہوا، ان کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا گیا۔ مصائب کی اس تربیت گاہ میں اسلامی کیفیت کا طاری ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں

کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ اور جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے، تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی، دوسری طرف اس کشمکش کی وجہ سے اسلام کی دعوت پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان ستائے اور پیٹے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انھیں معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے۔ کوئی ان کی ذاتی غرض نہیں ہے۔ یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی سچائی ان پر کھل گئی ہے، تو ان کے دل میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس سچائی کو معلوم کریں کہ آخر وہ کیا چیز ہے، جس کے لیے یہ لوگ ایسی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انھیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اس سے انسانی زندگی میں اس طرح کا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھتے ہیں، جو محض صداقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں۔ اور جان و مال اولاد ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں اور یہی سچائی ایک تیر کی طرح جا کر ان کے دل پر بیٹھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سوائے ان لوگوں کے جن کو کسی نہ کسی دنیوی غرض نے اندھا بنا رکھا تھا، ہر صداقت پسند آدمی کو اس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اسلام اور ہمارا ملک

یہ ہے اسلام کی اصل دعوت اور اس کو پیش کرنے کا وہ طریقہ، جو عرب میں رسولِ مقبول ﷺ نے اختیار فرمایا۔ ان دونوں چیزوں کو نظر میں رکھ کر ذرا آپ غور فرمائیں کہ اس وقت آپ ہندستان کی اس دنیا میں اسلام کو کس حال میں دیکھ رہے ہیں۔

اسلامی قوانین معطل ہیں، اخلاق میں، معاشرت میں، معیشت میں اور زندگی کے سارے معاملات میں اصولِ اسلامی کا عمل دخل پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دلوں اور دماغوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ آنکھیں بظاہر دیکھتی ہیں لیکن ان

کا زاویۂ نظر بدل گیا ہے۔ زبان بولتی ہے لیکن اس کے طرز اور مقصد میں فرق آ گیا ہے۔ یہ اس ہندستان کا حال ہے، جس کی گود میں ایسے ایسے اولیاء اللہ اور مجاہدین فی سبیل اللہ موجود رہے ہیں، جن کے وجود سے اور جن کے کارناموں سے اسلام کی تاریخ جگمگا رہی ہے۔ اور آج بھی اس ملک کے اندر اس ملت کی گود میں ایسے ایسے چہرے موجود ہیں کہ اگر ان کو چمکنے کا موقع ملے تو اس اندھیرے میں آج بھی اُجالا ہو سکتا ہے۔

ایک طرف تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے حالات اس قدر ابتر اور مایوس کن ہیں، دوسری طرف یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس ملک میں رسول اللہ ﷺ کی نام لیوا یہ ملت نیم جان چاہے ہو گئی ہو لیکن بے جان نہیں ہوئی ہے۔ ''مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے'' ملت کے ایمانی احساسات جو اس کے اندر سے اٹھ رہے ہیں اور باہر کے خطرات جو اس کے وجود کو دھمکا رہے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے۔ ع

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

اس گئی گزری حالت میں بھی بے شمار دینی درس گاہیں اور مدرسے اپنا کام کر رہے ہیں۔ یہی افلاس کی ماری ہوئی اور ایمانی تقاضوں سے غافل امت اتنے بڑے بڑے تعلیمی ادارے چلا رہی ہے، جن کا سالانہ بجٹ لاکھوں روپے ہوتا ہے۔ آج بھی اس ملت میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں، جن کے تقویٰ و طہارت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ بے شمار اہل ایمان اپنا گھر بار چھوڑے ہوئے دین کی خاطر حرکت و عمل میں مصروف ہیں۔ بہت سی جماعتیں ملت کی دینی و اخلاقی اصلاح کے لیے کوشاں اور ان کے سیاسی و معاشی مسائل حل کرنے میں مصروف ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے مسجدیں دن بدن آباد ہوتی جا رہی ہیں۔ گاؤں گاؤں دین داری کے چرچے پھیل رہے ہیں۔ اللہ ان سب کوششوں کو قبول فرمائے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، مگر کیا بات ہے کہ وہ نقشہ سامنے نہیں آتا، جو دعوتِ دینی کا خاصہ ہے۔ حالاں کہ جب بھی اسلام کی دعوت اپنی مکمل شکل میں اٹھی ہے دنیا کے سامنے وہی آزمائشوں اور مصائب کا نقشہ سامنے آ گیا ہے۔

بگاڑ کے وجوہ

غور کیا جائے تو اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں:

۱۔ خواص میں بگاڑ

ایک تو یہ کہ مصلحین ملت دور سے نظر آنے والے اوپری بگاڑ پر نظریں جما لیتے ہیں اور اس کے سدھار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ عقیدہ کا بگاڑ اور عمل کی خرابیاں بے شک عوام میں پائی جاتی ہیں۔ وہمی باتوں اور ٹونے ٹوٹکے میں یقیناً عوام ہی مبتلا ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ وہ عوام ہی ہیں، جن کو کلمہ تک یاد نہیں۔ ان بے چاروں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمان کس کو کہتے ہیں اور مسلمان کو کیسا ہونا چاہیے۔ سینما کے ٹکٹ گھر پر جو بھیڑ نظر آتی ہے وہ بھی عوام ہی ہیں۔ جوئے خانوں میں اور بازار کے چوراہوں پر جو گالم گلوچ میں مصروف ہیں وہ بھی عوام ہی ہیں۔ یہ اور اس طرح کی وہ بیسیوں خرابیاں عوام ہی میں ہیں، جن کو ہر مبلغ اور ہر واعظ دینی درد میں ڈوب کر بیان کرتا ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ ساری خرابیاں بس عوام کے اندر ہیں اور اس ملت کے خواص پوری طرح صحت مند ہیں صحیح نہیں ہے۔ اگر صحیح علاج کے لیے صحیح تشخیص ضروری ہے تو ہمارے مصلحین کو اس سے زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھنا ہوگا کہ بگاڑ کا اصل سرچشمہ کہاں ہے؟ اور جب وہ اس طرح غور کریں گے تو انھیں نظر آئے گا کہ یہ عوام جن کا رونا ہر شخص روتا ہے، بے چارے بگاڑ کے مارے ہوئے ہیں بگاڑ کو پیدا کرنے والے ہرگز نہیں ہیں۔

ہمیشہ قوم میں دو طبقے ہوا کرتے ہیں: ایک طبقہ عوام کا اور دوسرا طبقہ خواص کا۔ جس شخص نے بھی قوموں اور ملتوں کو بگاڑنے یا سدھارنے والے اسباب کا اور اس نظر سے تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا وہ

اس نتیجے پر پہنچے گا کہ بگاڑ ہو یا سدھار یہ ہمیشہ اونچے یعنی خواص کے طبقہ سے شروع ہوتا ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ بگاڑ یا سدھار نیچے سے شروع ہو کر بلندی تک پہنچتا ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اوپر سے شروع ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ نیچے تک چھا جاتی ہیں۔ یہ ایسی بات ہے، جس کی صداقت پر تاریخ عالم بھی گواہ ہے اور قرآن بھی: اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ○ (بنی اسرائیل:۱۶) ''جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اب اگر ہمارے مصلحین یہ سمجھتے رہے کہ سارا بگاڑ عوام میں ہے، بس انہیں کو سدھارنے کی کوشش کی جائے اور خواص میں سب خیریت ہے تو نہ یہ تشخیص صحیح ہوگی نہ علاج کی یہ تدبیریں کارگر ہوں گی۔ اگر علاج کی یہ ساری ہماہمی محض ثواب کی خاطر نہیں ہے، بلکہ ثواب کے ساتھ ہی اس علاج کا مقصد یہ بھی ہے کہ مریض صحت مند ہو تو تشخیص پر نظر ثانی کر کے طریق علاج کو بدلنا ہوگا۔ اور فساد و بگاڑ کے اس سرچشمہ کو پاٹنا ہوگا، جہاں سے فساد و بگاڑ کے سوتے پھوٹتے ہیں اور پوری امت کو ترکیے دے رہے ہیں۔ اگر اس طرح قرآن کے بتائے ہوئے طریقے سے دیکھا جائے تو کیا عجب کہ انھیں میں سے بہت سے لوگ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ علاج کے مستحق قرار پائیں، جو آج علاج کرنے والوں میں پیش پیش ہیں۔

۲- دین و دنیا کی تفریق

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں۔ ان کے دنیا دار حلقے اور دین دار حلقے دونوں میں غیر شعوری طور پر مذہب کا وہی دین و دنیا کی تقسیم و علیحدگی کا تصور آ گیا ہے، جس کو مٹانے کے لیے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام آتے رہے اور آخر میں دنیا و دین کی تقسیم کو ختم کر کے مکمل دین کا سب سے کامیاب نمونہ رسول عربی ﷺ نے پیش کیا۔

کھلی بات ہے کہ اسلام دوسرے مذہبوں کی طرح محض پوجا پاٹ کا مذہب اور چند مذہبی اعمال اور رسموں کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک مفصل ہدایت ہے۔ اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان سب میں ویسا ہی ربط و تعلق ہے، جیسا ایک زندہ جسم کے مختلف اعضا میں ہوتا ہے۔

آپ کسی زندہ آدمی کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیں۔ آنکھیں اور کان اور زبان جدا کر دیں۔ معدہ اور جگر نکال دیں اور بس ایک دل اس کے سینہ میں رہنے دیں۔ کیا اس کے بعد بھی یہ باقی بچا ہوا جسم زندہ رہے گا؟ اور اگر زندہ رہا بھی تو کیا وہ کسی کام کا ہوگا؟

ایسا ہی حال اسلام کا ہے۔ عقائد اس کا دل ہیں۔ وہ طرزِ فکر، مقصد زندگی اور کسی خیال یا عمل کی اچھائی برائی ناپنے والا پیمانہ جو ان عقائد سے پیدا ہوتا ہے اس کا دماغ ہے۔ عبادات اس کے وہ ستون ہیں، جن پر وہ کھڑا ہوتا ہے۔ معیشت، معاشرت، سیاست اور اجتماعی نظم کے وہ اصول جو زندگی کے لیے اسلام نے پیش کیے ہیں وہ اس کے لیے معدہ اور جگر اور دوسرے اعضائے رئیسہ کا حکم رکھتے ہیں، دین کو دنیا سے الگ کر لینے کے بعد یہ تمام حصے جڑے ہوئے نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے الگ الگ ہو جانے کے بعد اسلام کا بھی وہی حشر ہونا چاہیے، جو ایک زندہ جسم کے ہاتھ پاؤں اور گوش و زبان کاٹ لینے کے بعد ہوگا۔

یہ اپنی زندگی کو دینوی زندگی اور مذہبی زندگی کے دو خانوں میں بانٹ دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ان مختلف اجزا کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ دماغ اور پھیپھڑوں اور معدہ و جگر سب کا فعل خراب ہو گیا ہے۔ اور قلب بھی کچھ نہ کچھ اس زہر سے متاثر ہوا ہے۔ یہ تو اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے۔ عمل کو جب بھی عقیدہ سے بے تعلق کر دیا جائے گا عقیدہ بھی مرجھانے سے نہیں بچے گا۔ جہاں یہ بات صحیح ہے کہ عقیدہ ہی عمل کا بیج ہے وہیں یہ بات بھی صحیح ہے کہ عمل سے عقیدہ کو توانائی ملتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو طاقت بخشتے ہیں اور طاقت حاصل بھی کرتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ الگ کر دیا جائے تو دونوں آہستہ آہستہ پژمردہ ہو جائیں گے۔

سوچنے کی بات

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اگر صحیح ہے — اور قرآن و سیرت رسولؐ گواہ ہے کہ صحیح ہے — تو پھر ہم کو پوری ایمانی جرأت کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہمارے اسلام کو اپنانے اور پیش کرنے کا رُخ پورا کا پورا وہ نہیں ہے، جو رسولِ مقبول ﷺ اور ان کے اصحاب کا تھا۔ دینی مدرسے کھولنا، دینی تعلیم کا انتظام کرنا، عقیدہ و عمل کو درست کرنے کی تعلیم، نماز اور روزہ کی تبلیغ، اخلاق و معاملات میں نیکی اختیار کرنے

کی تلقین، ناواقف بندگانِ خدا تک نعمت دین پہنچانے کی جدوجہد۔ اس راہ میں محنت کرنا، وقت لگانا، پیسہ خرچ کرنا، یہ سب کچھ صحیح، نہایت مبارک اور انتہائی سعادت کی چیزیں ہیں۔ اور ہمیں امید بھی رکھنا چاہیے اور دعائیں کرنا چاہیے کہ یہ خدمات خدا کی جناب میں شرفِ قبول پائیں۔ مگر ساتھ ہی اس حکمت و بصیرت سے کام لے کر جس کو خیر کثیر کہا گیا ہے ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان تمام کاموں سے قرآن اور اس کے لانے والے صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا پورا ہو رہا ہے؟ سوال یہ نہیں ہے کہ ہم ایمان و عمل میں قرآن کے معیار اور سیرت پاک کے نمونہ پر پورے اترتے ہیں یا نہیں؟ سوال صرف اس کے رخ کا ہے۔ ہمارے عمل اور ہماری دینی سرگرمیوں کا ارتقاء کیا اسی رُخ پر ہو رہا ہے، جس رخ پر اولین اہلِ ایمان کا ہوا تھا؟ معیار کے اعتبار سے ہم اس مقام تک پہنچنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے لیکن ہمارا رُخ تو اس جانب ہونا چاہیے۔

یوں تو انسان کو بڑی طاقت بخشی گئی ہے۔ وہ اپنی تسکین خاطر کے لیے اپنے ہر عمل پر کسی برگزیدہ دینی اصطلاح کو فٹ کر سکتا ہے، جیسا کہ ہر ترکِ وطن کو حتی کہ جان و مال کے ڈر سے بھاگ جانے کو بھی ہجرت جیسا معزز لقب دے دیا گیا ہے۔ حالاں کہ ہر واقف دین جانتا ہے کہ ہجرت اس مرحلہ کو کہتے ہیں جب کہ رسول اور اصحابِ رسول اپنے رب کی مکمل بندگی کے لیے گنجائش نہ پا کر اور اپنے مخاطبین پر دین کی حجت تمام کر کے کسی ایسی جگہ منتقل ہوتے ہیں جہاں وہ مکمل بندگی کر سکیں اور اس ہجرت کے بعد اس مقام کے لیے خیریت نہیں رہتی جہاں سے رسول و اصحابِ رسول ہجرت کر جائیں۔

اسی طرح دوسری چیزوں میں بھی علم و عقل والا انسان بہ آسانی یہ کر سکتا ہے کہ اگر وہ بلندیوں پر نہیں جا سکتا یا نہیں جانا چاہتا تو ان بلندیوں کو اپنی پستیوں میں اتار لائے لیکن اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ قیامت کے دن خدا کی میزان میں وزن حق اور حقیقت کو حاصل ہوگا نہ کہ اپنی تجویز کی ہوئی چند شکلوں اور اصطلاحوں کو۔

ایک سیدھی بات جو عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے صالح اور اہل ایمان بندوں سے وراثت ارضی اور سربلندی کا وعدہ کیا ہے۔ اب اگر ہماری تمام دینی سرگرمیوں کے بعد بھی وعدۂ الٰہی پورا نہیں ہو رہا ہے تو یہی ماننا پڑے گا کہ ہمارے عمل ہی میں کوئی نقص ہے، کوئی وجہ نہیں کہ آم کی گٹھلی لگائی جائے تو قانون قدرت کے مطابق آم کا درخت پیدا ہو اور آم کے پھل دے۔ لیکن ایمان کا بیج بونے کے بعد ایمان کا درخت پیدا نہ ہو، نہ وہ پھل دے، جس کا وعدہ خداوند قدوس نے کیا

ہے۔ نمازیں پڑھنے والوں کی ہم میں کمی نہیں، روزے رکھنے والوں کا شمار نہیں۔ ہزارہا اہل ایمان کسی نہ کسی شکل میں دین کی خدمت میں مصروف اور سرگرداں ہیں۔ لیکن وہ نتیجہ نہیں نکلتا آخر بات کیا ہے؟ چھوڑیے اس نتیجہ کو ممکن ہے وہ ایسا انعام ہو جس کا عمل کی نوعیت سے کوئی منطقی و عقلی تعلق نہ ہو، لیکن یہ کیا بات ہے کہ اس قدر نمازوں، اتنے چلوں اور اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کی اس گونج کے باوجود طاغوت کے یہاں کوئی ہلچل نہیں مچتی۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو اہلِ بصیرت مطمئن ہو جاتے کہ اس عمل کے آثار شروع ہو گئے، جس کے نتیجے میں اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا انعام ملا کرتا ہے۔

یہ دنیا کی کسی کامیابی کا نہیں آخرت کی نجات کا سوال ہے۔ یہ دنیا، یہاں کی دولت، یہاں کی طاقت، یہاں کی وجاہت اور یہاں کا تقدس سب یہیں رہ جائے گا۔ قیامت کے روز وزن صرف حق کو حاصل ہوگا: ''اَلْوَزْنُ یَوْمَئِذِ الْحَقُّ۔'' اس لیے ہر صاحب ایمان کو اپنے زیادہ سے زیادہ عمل پر بھی مطمئن نہ ہو کر پورے اضطراب اور پورے اخلاص سے سوچنا چاہیے کہ اس سوال کا قرآن اور حقیقت پر مبنی جواب کون سا ہے؟ جو اہل ایمان اس طرح مضطرب ہو کر سوچیں گے انھیں خود اپنے باطن میں اس کا جواب مل جائے گا۔ اور باطن سے یہ جواب حاصل کرنے کے لیے انھیں بیرونی مدد بھی اپنے آس پاس ہی مل جائے گی۔ البتہ جو لوگ اپنی سوچی ہوئی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور اپنے عمل سے مطمئن و سیراب ہیں انھیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ممکن ہے خدا ان کو کسی ایسے مقام پر پہنچا دے جہاں ان کا یہ اطمینان شکست ہو اور ان کے اندر بھی تلاش حق کی طلب پیدا ہو۔ شاید ایسے ہی اطمینان کے نشہ میں مست اور اپنے عمل سے خود سیراب ہو جانے والے اصحاب زہد و عبادت سے اقبال نے کہا ہے:

اندازِ بیاں گرچہ بہت خوب نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

☆☆